بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہم نے ۱۹۴۱ء سے طریقِ انبیاء علیہم السّلام پر کام کرنے کا بیڑہ اُٹھایا، اور ایک لمبا عرصہ ہر قسم کی تنگ حالی اور مصائب کے باوجود بہت اطمینان سے گزرا۔ کبھی ذہن اُلجھا نہیں کہ کہیں ہم صحرائے حیات کی یونہی آوارہ گردی تو نہیں کر رہے یا جادۂ اقدام کو بار بار بدل کر تجربے تو نہیں کر رہے اور ان تجربوں کی وجہ سے ہم اپنے مقصد و منزل کی سمت کھو تو نہیں بیٹھے۔ نہ ہمیں کبھی رتّی بھر یہ شبہ ہوا کہ ہماری گاڑی کے ڈرائیور کہیں اپنے نئے ذہنی منصوبوں پر تو نہیں چل پڑے اور ساتھ ہمیں بھی گھسیٹ نہیں رہے۔ نہ یہ اندیشہ کہ جو کوئی بھی سربراہ بنا وہ رفتارِ نتائج کو بدلنے کے لیے طریقِ انبیاء میں تغیر کر کے کوئی نیا راستہ دریافت کرنے کے چکر میں ہو تا کہ کوئی اچنبھے کا کام کر دکھائے۔ کبھی ہمارا تشخص دھندلایا نہیں۔ اُصول، قدریں اور معیارات بدلے نہیں، کبھی دوسروں کی ریس اور نقالی کا رجحان ہم میں نہیں پیدا ہوا جو احساسِ کہتری کا نتیجہ ہوتا، کبھی مایوسی نہیں ہوئی کہ اب ہمارے لیے دعوت کا میدان تنگ ہو گیا ہے اور ہمارے دہقان مزاج کارکن پنیری لگانے کے تھکا دینے والے بے کیف کام میں فرار کرنے لگے ہیں۔ کبھی اجتماعی فیصلوں میں دُھندلاپن یا دو رُخاپن ایسا نہیں پایا گیا جو ہمارے ساتھیوں کو اُلجھا دے۔ کبھی عام حلقوں میں شکوک و شبہات اور چہ میگوئیاں فروغ نہیں پا سکیں۔ ہمارے ہاں سیاست کا کام پہلے سے ہو رہا تھا مگر اس کی باگ ڈور دین کے ہاتھ میں تھی اور ساری سرگرمیاں دینی مفاد اور تقاضوں کے مطابق ہوئیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا آج بھی عین یہی حالت ہے اور آئندہ بھی ہم اس کو نبھا سکتے ہیں؟

طریقِ انبیاء (اور اسوۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطابق صلاح و فلاح کا کام کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک تو ملّت کی بہبود اور پوری انسانیت کی تعمیرِ نو کے لیے دعوت الی اللہ کے واحد طریق کو اہمیتِ کاملہ دی جائے، باقی جو کچھ بھی ہو اسی دعوت کے فروغ اور اسی کے عروج اور اسی کے اثر و نفوذ کے لیے ہو۔ جس کام کا ماحصل بندے کا خدا سے رابطہ نہیں؛ وہ خارج از بحث ہے۔

طریقِ انبیائ (اور اسوۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا مطالبہ میرے مطالعہ کی رُو سے یہ ہے کہ تقریروں اور جلسوں، یا تحریروں اور جرائد و کتب سے جتنا کچھ بھی معاشرے کے ذہنی ماحول پر اثر ڈالا جا سکے، ہر حال میں فرد بہ فرد ملنے اور گفتگو میں کرنے کے سلسلے کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ اجتماعی حالات اور سرگرمیاں جو کچھ بھی رہیں، اس بنیادی طریقِ کار کو کبھی ترک نہ کیا جائے، اور اگر کچھ لوگوں کو تحریک دلانے کی ساری کوششیں ناکام ہو جائیں تو ان کو متفق یا حامی کارکنوں کے مقام پر کام سنبھالنے کا مشورہ دے کر رکنیت کے بارِ گراں سے سبک دوش کر دیا جائے۔ ماسوائے ایسے محبانِ تحریک کے جن کے پاس کوئی واضح عذر ہو اور اسے متعلقہ حلقہ، جماعت قبول کرے۔

اِس کام کا کوئی اور شارٹ کٹ نہیں ہے۔ جتنے افراد کو آپ پوری طرح دین کے لیے مسخر کر لیں گے، وہی کچھ آپ کی اگلی طاقت ہوں گے، ورنہ جلدی ہو تو بھُس بہت ملے گا۔

طریقِ انبیائ (بہ شمولیتِ اسوۂ حسنہ) کے تحت دعوتِ حق کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ داعیانِ الٰہی اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں ایک گونہ رنگِ درویشی اختیار کریں۔ ورنہ افراد کی شاندار زندگیاں اور مسرفانہ تقاریب اور تحریک کی مرعوب کُن نمائش کاریاں لازمی طور پر مردانِ کار کو ایثار و قربانی کی روش چھوڑ کر دولت سمیٹنے کی طرف متوجہ کر دیں گی جس سے نہ صرف تحریک کا کام ثانوی اہمیت اختیار کرے گا بلکہ افراد میں حصولِ دولت اور حصولِ مفاد

کی ایک ایسی ریس لگے گی جو جماعت کے اندر بھی اثر انداز ہو گی۔ یہ تسلیم کہ تبدیلیٔ تمدّن سے معیارات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ مگر ان تبدیلیوں کے بعد بھی طبقۂ غربا، درمیانہ طبقہ اور طبقۂ اعلیٰ موجود ہیں۔ کم سے کم آج کے معیارات کے لحاظ سے بھی درمیانہ طبقہ کی حدوں میں رہنا، بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ نچلے درمیانہ طبقہ میں رہا جائے۔ اس سے غریب عوام سے رابطہ آسان ہو جاتا ہے اور مفاد اور آرام کی قربانی دینا اور مشقت کرنا بھی دل پسند بن جاتا ہے۔ ایسے درویش مزاج لوگوں میں اگر دولت کے دروازے کھلیں بھی تو وہ حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور جناب ابوالدحداحؓ جیسے کردار نمودار ہوں گے جو دولت کو تحریک کے قدموں میں بھی ڈالیں گے اور اہلِ حاجت پر بھی قربان کریں گے۔ عمرؒ بن عبدالعزیز بھی تو تھے جن کے دَور میں تمدّن زمانۂ نبوت سے بہت ترقی کر گیا تھا، مگر دریائے تمدن ایک طرف بہتا رہا اور اس کے ساحل میں ایک درویش خلیفہ نے اپنا بوریائے خلافت بچھایا اور راہبوں جیسی زندگی گذار دی۔

آج ان کہانیوں کو ہم لوگ جب اسٹیجوں یا جرائد سے معاشرے کو سُنا رہے ہوتے ہیں اور حضورؐ اور صحابہ کرام کی فاقہ مستیوں کا حال بیان کر رہے ہوتے ہیں تو ہمارا اپنا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دن کا فاقہ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ ہم نے اپنے عالی شان اسلاف کی طرح اپنے کندھوں سے قیمتی اُونی چادریں یا کمبل اُتار کر کبھی کسی حاجت مند کو نہیں دیے ہوتے۔ ہم نے اپنے کھانے یا پھلوں کو اُٹھوا کر کسی ہمسائے کو، یہ معلوم ہونے پر نہیں بھجوایا ہوتا کہ اُس کے بچے بہت ضرورت مند ہیں۔ ہم لوگوں نے کتنی بیواؤں اور کتنے یتیموں اور طلبہ اور مریضوں کی ضروریات کا کسی درجہ میں انتظام اپنے ذمہ لیا ہوتا ہے۔ جماعت کے فنڈ میں چند روپے جمع کرا کے ہم اس سے فارغ ہو جاتے ہیں کہ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرنی ہے۔

بلکہ ہمارے ہاں سابق روایت یہ تھی کہ جماعتی مناصب پہ کام کرنے کے لیے جن لوگوں کی خدمات طلب کی جاتیں وہ خود جماعت ہی سے کہتے کہ جو کچھ آپ مقرر کر دیں، مجھے تو کام کرنا ہے۔ چنانچہ کم سے کم درجے کی ضروریات کا ایک سرسری اندازہ کر کے کسی شخص

کا معاوضہ مقرر کر دیا جاتا اور وہ اطمینان سے کام میں محو ہو جاتا۔ روزنامہ تسنیم کی ایڈیٹری کے زمانے میں مصباح الاسلام[1] فاروقی جیسا حساس شخص ایک انقلابی جذبۂ ایثار کے تحت بھنے ہوئے چنے کھا کر بھی گذارا کرتا تھا۔ بعد میں وہ شعبۂ نشر و اشاعت کے ناظم ہوئے (جو فوجی افسری کو چھوڑ کر آئے تھے) ان کے مقابلے میں آج کا تو ایک دفتری معاون اور ڈرائیور بھی مروجہ معیارات کے مطابق لڑ جھگڑ کر تنخواہیں اور ترقیاں مانگتے ہیں — کیوں نہ مانگیں کہ اب ہمارے دفتری نظام میں سکیل اور ترقیاں، اضافے اور بونس سب مقرر ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ دولت کا جادو اتنا زوردار ہے کہ سکیلوں سے بھی بات آگے نکل جاتی ہے۔ پھر دفاتر کی توسیع اور عہدوں اور ملازمتوں کی تکثیر اتنی ہے کہ اس کی وجہ سے "افراد زیادہ اور کام کم" کی صورت پیدا ہو گئی ہے، جب کہ پہلے افراد کم اور کام زیادہ" کا نقشہ تھا۔ پہلے رضاکار کارکن بہت زیادہ کام کرتے تھے، اب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ہر کام کے لیے ہمہ وقتی ملازم بکثرت موجود ہیں، اب ہماری ضرورت نہیں، یعنی ان میں پہلا سا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔

طریقِ انبیاء پر کام کرنے والوں کے لیے قرآن و حدیث کے سرچشمہ ہائے علم سے مسلسل رابطہ رکھنا اور بڑھانا ضروری ہے۔ اسی ضمن میں جماعت کے عقیدہ، نصب العین، نقشۂ تنظیم اور طریقِ کار کو واضح کرنے کے لیے جو لٹریچر برسوں میں قرآن و حدیث کے دلائل اور اسوۂ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے نظائر کی بنیادوں پر تیار کیا گیا ہے، اس کا مطالعہ کرنا دین اور لادینیت کی موجودہ کشمکش اور فرقہ وارانہ چشمکوں اور قسم قسم کی تنظیموں کے

---

[1] آج اس شخص کی بیوہ اور اس کے بچوں کا حال تو کجا، کراچی کے اپنے حلقوں سے یہ پتا تک نہ چل سکا کہ وہ اب ہیں کہاں؟ یوں ہم اپنے اہم ساتھیوں کی قبروں اور ان کے پس ماندگان سے روگرداں ہو کر جہادِ اقامتِ دین میں مصروف رہتے ہیں۔

رنگ بن گئے طور طریقوں کے اس پیچیدہ دور میں نہایت لازم رکھا گیا ہے، اور یہ لٹریچر بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات اور ان تعلیمات کے علمبرداروں کے کارناموں سے ہم کو قریب تر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کی زبان میں دین کے حقائق اور ان کے وسیع تر تصورات سامنے آتے ہیں اور نت نئی اُلجھنیں صاف ہو جاتی ہیں۔

سالہا سال سے قرآن و حدیث کے لیے سچے جذبۂ وابستگی اور جماعت کے رہنما لٹریچر کے ضروری مطالعے کے بغیر ہمارے ہاں دستوری اور روایتی طور پر رکنیت نہیں مل سکتی تھی۔ اگر ہم اپنے مختلف اہم معیارات کے ساتھ اس معیار کو بھی نظر انداز کر دیں تو معاملہ رُکنیت کے نظام کے درہم برہم ہونے تک ہی نہیں رُک جائے گا، بلکہ جاہ و منصب کے نہایت مضبوط معیارات بھی تباہ ہو جائیں گے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو خدانخواستہ نام چاہے آپ جماعتِ اسلامی سے بھی زیادہ شاندار رکھ لیں اور عددیت کی بڑھوتری آکاس بیل کی طرح زوروں پر ہو، تب بھی طریقِ انبیاء پر کام کرنا ناممکن ہو گا۔ اور طریقِ انبیاء (خصوصاً اسوۂ خاتم النبیینؐ) سے ہٹ کر کسی راستے پر چلنے سے اقامتِ دین کی منزل تو نہیں مل سکتی، اور بہت کچھ مل سکتا ہے۔

طریقِ انبیاءؑ پر کارِ دعوت کرنے والوں کے لیے ایک شرطِ لازم یہ ہے کہ وہ عملی کردار کے لحاظ سے اپنے عقیدہ، اخلاقی تصورات، تنظیمی معیارات اور اسلامی تہذیبی قدروں کے لحاظ سے ایک خوش آئند اور پُرکشش نمونۂ انسانیت ہوں۔ لوگ اُن کو دیکھ کر محسوس کریں کہ یہ ایک اُونچا اور بہادر آدمی ہے اور اس کے ساتھ چلنا باعثِ عزت !

اچھا پہن لینے اور اچھا کھا لینے، اور اعلیٰ عمارتوں میں جدید ترین سامانوں سے لیس ہو کر بیٹھنے، اکابر سے ملنے، شاندار تقریروں اور تحریروں اور مرعوب کُن جلسوں اور جلوسوں سے تحریکِ اقامتِ دین کی اصل قوت نہیں واضح ہوتی۔ اصل قوت تو اس پر منحصر ہوتی ہے کہ کون کتنا راست باز، نصفت شعار اور فیاض ہے؟ کون پاسِ عہد

میں کیا مقام رکھتا ہے، کس میں کتنا انکسار اور ایثار ہے، کون دیانت و امانت سے آراستہ ہے، کون اہل خانہ کے ساتھ، ہمسایوں کے ساتھ، ہم سفروں کے ساتھ اور دیگر تمام سماجی رابطوں کے دائروں میں اپنے ایک ایک قول و فعل سے یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ یہ شخص خدا پرستانہ اخلاق کا عکس اپنے اندر رکھتا ہے۔ خصوصیت سے لین دین میں، کاروباری امور میں، حصہ دارانہ مسائل میں عالی ظرف اور قابل اعتماد ہے۔ کون اختلافی مسائل میں بحث کرتے ہوئے صبر و تحمل سے گفتگو کرتا ہے، اپنی منوانے کے بجائے دوسروں کی بھی سنتا ہے۔ اور اپنی چیز فقط دلائل کے زور سے منواتا ہے، دھونس یا غصے سے نہیں، اسی طرح دوسروں کی ہر اس بات کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہے جو وزنی دلائل کے ساتھ آتی ہو۔ وہ دوسروں کو بآسانی معاف کر دیتا ہے اور دوسروں سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہے۔ عہدہ بر ہو تو ساتھیوں سے مساویانہ و برادرانہ طرز پر مشورہ لیتا ہے، لوگ تنقید کریں تو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے۔ پھر اگر سیاست کے میدان میں آئے تو وہ ہر قسم کی چالبازیوں اور مغالطہ انگیز طریقوں سے پرہیز کر کے راست گوئی اور حق بیانی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ دوسرے جو شاطرانہ اور دسیسہ کارانہ انداز کے خوگر ہیں، ان کے ذہنوں اور مکروفسوں اور طریق کار کو سمجھتا خوب ہے، مگر خود شاطرانہ سیاست کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ اول تو اپنے اصول و معیارات کے تحفظ کے لیے مخالفین سے اتحاد نہیں بناتا اور اگر بعض ناگزیر حالات میں ایسا کرنا پڑے تو اپنے غیر متبدل اصول و معیارات کے تحفظ کی گارنٹی پہلے لیتا ہے۔ اتحاد کا معاہدہ کر لینے کے بعد اس میں رخنہ اندازیاں نہیں کرتا۔ ذرا ذرا سے نفع و نقصان یا پسند و ناپسند کی بنا پر دوسروں سے غیر معتدل، غیر حلیمانہ، غیر حکیمانہ اور غیر صابرانہ طرز معاملہ اختیار نہیں کرتا۔ یعنی وقار کے معیار کو چھوڑ کر چھچھورپن کا طریقہ نہیں اپناتا۔ اتحاد کے معاملات میں مارکیٹنگ کی طرح بھاؤ تاؤ (BORGAINING) نہیں کرتا، اپنی تھوڑی قوت کو زیادہ دکھانے کے لیے نمائشی مظاہرات کے لیے مسرفانہ اہتمام نہیں کرتا۔ اس طرح کا وسیع دائرہ کردار ہے جو اسلامی تحریک میں درکار ہے۔

علوِ کردار یا بااصولیّت کے لیے ذوقِ استعجال بھی تباہ کن ہوتا ہے جس سے قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ یعنی جس کام کی جو فطری رفتار کسی معاشرے یا ماحول میں ممکن ہے، اگر آپ اس سے بار دل ہو کر یہ چاہیں کہ تیزی سے آپ بڑی طاقت بن جائیں، تیزی سے آپ برسرِ تمکن ہو سکیں اور تیزی سے آپ معاشرے کی سیاسی و معاشی زندگی کے سرچشموں پر قابو پالیں جب کہ صحیح اصول و کردار کے ساتھ اسلام کے انقلابی جادۂ دعوت پر پیش قدمی کرتے ہوئے ایسا ہونا جلد ممکن نہ ہو تو پھر آپ اس کے سوا اور کیا کریں گے کہ تحریک اقامتِ دین کے اصولوں اور طریقِ کار اور طریقِ تنظیم میں تبدیلیاں کریں اور رکاوٹوں اور حدوں کی تعداد روز بروز گھٹاتے جائیں۔ ایسی جلدی کے نتیجے میں اوّل تو ساری مساعی بکھر جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، ورنہ اگر کچھ بنے بھی تو اسلامی نظام تو نمودار نہیں ہو سکتا (ماسوا بعض جزوی اور ناتمام چیزوں کے)، بنے گا تو کوئی اور ہی نظام بنے گا۔ سو ایسا تو ہو ہی رہا ہے، ہم ہوں یا نہ ہوں۔

پس اپنے عقیدہ، نصب العین، طریقِ کار، تشخص اور کردار کی حفاظت ضروری ہے۔ کردار پر ایک حملہ ذاتی خواہشات اور مفاد کا ہوتا ہے اور دوسرا اجتماعی کش مکش کے دباؤ کی وجہ سے، جب کہ کوئی قوت اپنی بساط سے زیادہ بڑی اُلجھنوں میں کود دے یا اقتدار کی سیاسی و انتخابی دوڑ میں اتنی زیادہ محویت اختیار کرے کہ دین پیچھے سے پکارتا ہی رہ جائے، جیسے حضورؐ نے غزوۂ حنین میں آواز دی تھی کہ "اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہ" وہاں تو اتنے اچھے تیار شدہ مردانِ حق تھے کہ پُکار کر فوراً پلٹے، لیکن ہم جس ماحول کے پروردہ ہیں اور جن قوتوں میں گھرے ہوئے اور جن کمزوریوں کے حامل ہیں، شاید کسی موقع پر دین کی پکار سن ہی نہ سکیں۔

لہٰذا احتیاط!

تذکیر کی یہ باتیں دوسروں سے بڑھ کر چونکہ میری اپنی ضرورت ہیں، اس لیے کبھی کبھار ان کو چھیڑ کر اپنے شعور و احساس کا زنگ اُتارنے کی کوشش کرتا ہوں۔

یہ باتیں اس لیے ضروری ہیں کہ ہم سب لوگ چاروں طرف سے لادینیت اور نفس پرستی کے مٹھا ٹھیں مارتے سیلابی پانی کے درمیان گھرے ہیں جو جسموں تک ہی نہیں، دلوں اور دماغوں تک نفوذ کرتا ہے اور ایمان و شعور تک میں جا کر خلط ملط ہو جاتا ہے۔ اور شیاطین اِس سیلابِ غلاظت میں پہاڑ جیسی موجیں اچھالتے ہیں۔ ان موجوں سے کوئی پناہ ہے تو تحریکِ اقامتِ دین کے سفینۂ نوحؑ ہی میں ہے۔ اور یہ سفینہ دعوت اِلَی اللہ ہی کے چپوؤں سے اپنے نصب العین کے کوہِ جُودی کی طرف رواں رہتا ہے۔

تصیح بہ سلسلہ شمارہ گذشتہ

۱- ص ۴ کی قرآنی عبارت کے اعراب لگا لیے جائیں۔
۲- ص ۱۲- سطرِ آخری سے تیسری "خانے" کے بجائے "خانے"
۳- ص ۱۴- وکفیٰ بنفسك علیك الیوم حسیبا کے بجائے
کَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا۔
۴- ص ۱۵- سطرِ آخری سے چوتھی "پہچاں" کے بجائے "پہچان"
۵- ص ۱۸- سطرِ آخری سے دوسری مرطبیات کے بجائے "مرضیات"
۶- ص 〃 〃 〃 〃 لے لوثی کے بجائے "بے لوثی"